...o. 215667   Regd. No. 62...

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

No. 2...
...grams
...JUMAN

جلد ۲۲ - شمارہ ۱۲ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | ۲۲ مارچ ۱۹۶۳ء

ڈاکٹر محمود الٰہی

اُردو میں جدید طرز کا پہلا قصہ

اُردو زبان و ادب کو مغربی رجحانات اور نئے خیالات کا حامل بنانے میں جن تعلیمی اداروں کا ہاتھ رہا ہے، ان میں دہلی کالج کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی، ماسٹر رام چند، ذکاءاللہ، صلائے عام والے میر ناصر علی اسی کالج کے تربیت یافتہ تھے۔ مولوی کریم الدین بھی جو اپنی "کریم اللغات" کی وجہ سے طالب علموں کے حلقے میں اور تذکرۂ طبقات الشعراء کی بنیاد پر طبقۂ خواص میں مشہور ہیں، اسی کالج کے پروردہ تھے۔ مولوی کریم الدین پانی پت کے رہنے والے تھے مگر دہلوی مشہور ہوئے۔ ان کی پوری زندگی تصنیف و تالیف اور تعلیم و تعلم میں گزری۔ ان کی تصانیف کی تعداد کم نہیں ہے، تعلیم نسواں سے لے کر تذکرۂ شعراء تک کو انھوں نے موضوعِ قلم بنایا۔ چونکہ ان کی ہر تصنیف پر شروع سے آخر تک ایک مدرسانہ فضا چھائی ہوئی ہے اس لئے زبان و ادب کے درجۂ اوّل کے رہنماؤں میں ان کا شمار نہ ہو سکا لیکن انھوں نے ایک ایسی تصنیف بھی یادگار چھوڑی ہے جسے بجا طور پر اُردو میں جدید طرز کے قصہ نگاری کا نقشِ اوّل کہا جا سکتا ہے۔

اُردو میں قصہ نگاری کے فن نے داستان سے ناول تک ارتقا کی جو منزلیں طے کی ہیں، ابھی تک ان پر اس طرح تحقیقی نظر نہیں ڈالی گئی ہے کہ ان کے اہم نقوش سامنے آجائیں۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق ڈپٹی نذیر احمد کی مرآۃ العروس پہلا قصہ ہے جو بعض اہم فنی خامیوں کے باوصف بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیتا ہے اور روایتی قصہ نگاری کے خلاف صدائے احتجاج کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے قصہ نگاری کے جس طرز کو عام کیا یہ ان کا ایجاد کردہ ہے یا اس باب میں کسی کو ان کا پیش رو کہا جا سکتا ہے، یہ ایسے سوالات ہیں جن پر ابھی تک بحث نہیں کی گئی ہے اور اگر کی گئی ہے تو یہی نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اس طرز کے موجد وہ خود تھے۔

مرآۃ العروس کی اشاعت سے سات سال قبل (سنہ ۱۸۶۲ء میں) لاہور سے مولوی کریم الدین کی کتاب "خطِ تقدیر" شائع ہوئی جس کا ذکر فرانسیسی مستشرق گارسین دتاسی نے اپنے تیرھویں خطبے (۷ دسمبر سنہ ۱۸۶۳ء) میں اس طرح کیا:

> "حال میں جن مصنفین کی نئی مطبوعات شائع ہوئی ہیں، ان میں مولوی کریم الدین کا نام سب سے پہلے قابلِ ذکر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ سب ان کے نام سے واقف ہوں گے۔ موصوف نے اس سال چھ تصانیف شائع کی ہیں ... لاہور سے ایک اور کتاب نکلی جس کا نام "خطِ تقدیر" ہے۔ یہ کتاب اخلاق پر ہے۔ اگرچہ نثر میں ہے لیکن جا بجا اشعار بھی ہیں۔ اس کتاب کے سرورق پر ایک شعر بطور طغریٰ لکھا ہوا ہے"
>
> (خطبات شائع کردہ انجمن ترقی اُردو ص ۳۸۹)

دتاسی نے "خطِ تقدیر" کے تعارف کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے لیکن اس نے یہ بات نظر انداز کر دی کہ اس کا تعلق [illegible] قصہ سے ہے۔ مولوی کریم الدین نے "خطِ تقدیر" کا جو دیباچہ لکھا ہے

وہ خود اُردو کے افسانوی ادب کی تنقید کے سلسلے میں بڑا اہم ہے۔ دیباچہ کی نے اس دیباچے سے بھی تعرض نہیں کیا۔

مجھے حال ہی میں "خط تقدیر" کے دوسرے ایڈیشن کا ایک نسخہ دستیاب ہوا ہے جو ۱۸۶۹ء میں مطبع پنجابی لاہور میں چھپا تھا۔ اس نسخے کے سرورق پر یہ عبارت ملتی ہے:

"خط تقدیر مترجم بحسب اجازت مصنف بمطابق اس نسخہ صحیحہ کے جواب کی دفعہ مصنف نے ازسرنو صحیح اور ترجمہ کرکے خود طبع کرائی ہے بواسطے استفادہ طلبا مدارس اضلاع پنجاب کے ۱۸۶۹ء در مطبع پنجابی لاہور باہتمام منشی محمد عظیم مالک مطبع کے چھپی"

میں نے سرورق کی یہ عبارت صرف اس لئے نقل کی ہے کہ "مترجم" سے جو غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے وہ دور کردی جائے۔ چونکہ یہ کتاب داخل نصاب ہوچکی تھی اس لئے طلبہ کی آسانی کے لئے مصنف نے متن کے مشکل الفاظ کا ترجمہ حاشیے پر لکھ دیا ہے۔ اسی رعایت سے اس ایڈیشن کو مترجم کہا گیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مولوی کریم الدین کا طبع زاد قصہ ہے۔

اس کتاب پر مصنف نے طویل دیباچہ لکھا ہے جس کے ضروری اقتباسات یہاں اس غرض سے درج کئے جاتے ہیں کہ مصنف کے نظریہ اور کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائے:

"..... مدت سے یہ آرزو تھی کہ تقدیر و تدبیر کا مضمون بطور قصہ لکھا جائے بشرطیکہ مخالف کسی کے مذہب کے اور خلاف رائے اہل فلسفہ کے بھی نہ ہو اور جو باتیں اس میں درج ہوں وہ اخلاق و اطوار اور تجربات انسانی ایسی طرح کے ہوں جن کا اثر طبیعت انسان پر ہوکے بہت نتیجہ پیدا کریں اور کہانی ایسے طور پر ہو کہ جو شخص پڑھے یا سُنے اس کو خیال ہو کہ یہ قصہ میرے حسب حال لکھا گیا ہے اور زبان اس قصے کی اردو خالص اور سلیس اور محاورات دلچسپ روزمرہ ٹھیک اشعار حسب موقع قابل یاد رکھنے کے ہوں تاکہ اس زمانہ کے طلبا کو شوق نئی تصنیف کرنے اور مضامین حقیقیہ لکھنے کی ترغیب ہو۔ مگر ایشیائی قصوں کی روش اور طور چھوڑ کر نئی چال چلنا بہتر ہے۔ اس کی ضرورت اس واسطے ہوئی کہ سات سو برس سے عربی اور ترکی میں اور ایک سو برس سے ہندی یا اُردو میں قصہ نویسی کا جو شوق لوگوں کو پیدا ہوا تو اس دن سے آج تک یہ دستور رہا ہے کہ ان مصنفوں نے بادشاہوں یا تاجروں یا فقیروں کی کہانیاں لکھی ہیں اور کوئی قصہ مضامین عشقیہ اور محاورات واجب التعزیر سے خالی نہیں ہے اور جس راہ پر اول مصنف چلا تھا وہی سڑک آج تک جاری ہے۔ کسی نے دوسری روش اختیار کرنے کا خیال بھی نہیں کیا۔۔۔

... متقدمین اس امر میں (قصہ نویسی کی غرض و غایت سمجھنے میں) معذور ہیں کیونکہ ان کو اس کا تجربہ حاصل نہ تھا اور اس قاعدہ سے عموماً مصنفین قصص ایشیا ناواقف محض تھے۔ اگر واقف ہوتے تو اس طور پر نہ چلتے۔ اب اس زمانے میں خوب طرح کھل گیا اور ثابت ہو گیا کہ عام طور تصنیف سابق کا اچھا نہ تھا اس لئے بندہ نے وہ عام طور چھوڑ کر نئے طور سے یہ قصہ لکھا اور کوئی لفظ بیہودہ اس میں نہ آنے دیا تاکہ عورتیں اور مرد دونوں اس کتاب کو پڑھ کر حظ اٹھائیں۔ پر عشق کے پیرایہ میں اس لئے لکھا کہ بدون چاشنی عشق کے کوئی کہانی ایسی مزہ دار نہیں ہوسکتی کہ باشندے ایشیا کے اس پر متوجہ ہوں۔

... اگرچہ میں یہ عرض نہیں کرسکتا کہ جس طرز پر میں نے یہ قصہ لکھا ہے یہی طرز سب سے اچھا ہے شاید کوئی اور طرز جاذب طبع اور منتج حسنات کسی اور شخص کے ذہن پر ہویدا ہو جاوے پر میری طبیعت نے جو طرز حسب حال اس زمانے کے پسند کی ہے اور جس طور پر یہ قصہ مجھ کو لکھنا پسند آیا وہ یہی طرز ہے جو اس میں برتی گئی۔

... تشنہ المحمد کہ یہ منصوبہ درمیان ۱۸۶۲ء کے مقام لاہور میں بن پڑا اور اس کے فروغ شان کے واسطے عقل نے یہ رہبری کی کہ بخدمت جناب کپتان فلر صاحب بہادر ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن مدارس ممالک پنجاب ... بطور نذرانہ پیش کروں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ بعد ملاحظہ اور سماعت کے یہ قصہ منظور فرماکر بندہ کو ممتاز اور معزز بندہ کے اقران و اتراب میں فرمایا۔ ..."

مولوی کریم الدین نے روایتی قصہ نگاری کی جس شدت سے مخالفت کی ہے اور نئے طرز کی قصہ گوئی کو رواج دینے کے لئے جس عزم کا اظہار کیا ہے، یہاں ان پر کسی تبصرے کا موقع نہیں ہے کہنا صرف یہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے گھر کو پیش نظر رکھ کر نئے طرز کا قصہ لکھنے کی ضرورت محسوس کی اور مولوی کریم الدین نے پورے معاشرے کی اصلاح کے لئے یہ اقدام ضروری سمجھا۔ مولوی کریم الدین عشقیہ مضامین سے قصوں کو مبرا کرنا ضروری سمجھتے تھے لیکن ایشیا کے باشندوں کو متوجہ کرنے کے لئے انھوں نے اخلاقی باتوں میں عشق کی چاشنی بھی ملادی تھی اور اپنے قصے کو اس طرح نہ لکھ سکے جیسا وہ دل سے چاہتے تھے۔

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

ہماری زبان

۲۱ مارچ ۱۹۹۳ء

ادیبوں کو معاوضہ دیجئے

کسی زبان کے ادب کی ترقی کو پرکھنے کے معیار کیا ہیں؟ یہ بھی ہے کہ اس میں پورے وقت کے ادیب کتنے ہیں یا ایسے کتنے ادیب ہیں جن کی ساری آمدنی اُن کی تصانیف کے معاوضے پر مشتمل ہے۔ اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہندوستان میں اُردو ادب کی حالت کسی طرح قابلِ اطمینان نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ حکومت ادب کی سرپرستی کرتی ہے۔ کتابوں پر انعامات دیئے جاتے ہیں اور کچھ مشہور اور بزرگ ادیبوں کو پنشن بھی دی جاتی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اب کتب خانے پہلے سے زیادہ تعداد میں اُردو کی کتابیں خریدتے ہیں مگر ان سب باتوں کے باوجود اردو میں ایسے ادیبوں کی تعداد بہت کم ہے جو سنجیدہ اور معیاری ادب کے علمبردار ہیں اور جن کی تمام آمدنی اُن کی تصانیف کی وجہ سے ہے۔ آپ کو ایسے لکھنے والے مل جائیں گے جو چٹ پٹی کہانیاں لکھتے ہیں، ایسے رسالے مل جائیں گے جو مزے دار سنسنی خیز خبریں چھاپتے ہیں، ایسے لکھنے والے مل جائیں گے جو جاسوسی ناولیں لکھتے ہیں اور چونکہ وہ خوب بکتی ہیں اس لئے اچھی خاصی رقم بھی کما لیتے ہیں، مگر ہمیں اس وقت ان سے غرض نہیں۔ ایسے لکھنے والے ہر زبان اور ہر ملک میں ہوتے ہیں جو ادب میں تجارت کے اصول برتتے ہیں۔ ہمارا مقصد صاحبِ ہم اگر بھی سنجیدہ اور ٹھوس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ سماج اگر اچھا لکھنے والوں کی سرپرستی نہیں کرتا تو وہ لکھنے کے علاوہ کوئی ملازمت کریں گے، کوئی کام ڈھونڈھیں گے۔ کچھ دن وہ کسی نہ کسی طرح اپنی تخلیقی چنگاری کو روشن رکھیں گے اور رفتہ رفتہ حالات کی گرد اس چنگاری کو خاکستر بنا دے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی رسالوں میں پہلے اچھے اچھے اور روشن کارنامے نظر آتے ہیں، پھر ان کارناموں کے بجد گوارا کارنامے اور آخر میں انحطاط کے آثار۔ ہمارے نزدیک ادیبوں کا قصور اس معاملے میں کم ہے، سماج کا زیادہ۔ اگر اُردو دوستوں کو اپنا ادب عزیز ہے تو انھیں اس محنت کی مناسب قیمت بھی دینی چاہئے۔ مُفت کی کتابیں پڑھنا اپنے اوپر حرام قرار دے دینا چاہئے۔ ہر مضمون نگار کو کچھ نہ کچھ معاوضہ ضرور دینا چاہئے۔ کوئی نہ کوئی اخبار ضرور خریدنا چاہئے۔ سال میں کچھ کتابیں خریدنا اپنے اوپر فرض کر لینا چاہئے۔ اخباروں اور رسالوں کو مجبور کرنا چاہئے کہ وہ ہر شائع شدہ مضمون، نظم، غزل کا معاوضہ دیں۔ انجمن "اُردو ادب" کے مضامین کے لئے معاوضہ دیتی ہے۔ اب "ہماری زبان" کے معاونین کو بھی ایک حقیر معاوضہ پیش کیا جائے گا جو ادبی حلقے کی ممبری کی شکل میں ہوگا۔ ان سب باتوں کا التزام ہونے لگے تو لکھنے والوں کی مالی حالت یقیناً بہتر ہو گی اور وہ زیادہ سکون اور اطمینان سے اپنے فن کو نجات کا ذریعہ بنا سکیں گے۔

سیر بین

جس طرح بیاموں کی وبا عام ہے اسی طرح لکھنے والوں کا ایک نیا گروہ پیدا ہوا ہے۔ یہ لوگ صرف ایڈیٹروں کو خط لکھا کرتے ہیں اور اب ادبی رسالوں میں ان کی نگارشات کو ایک خاص درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ عام طور پر ان میں ایک چیز مشترک ہوتی ہے اور وہ ہے ایڈیٹر کی تعریف۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ایڈیٹر لوگ تعریف کے قابل نہیں ہوتے، مگر اگلے ایڈیٹر اپنی تعریف خطوں میں دیکھ کر ہی خوش ہو لیا کرتے تھے، اُسے چھپواتے نہیں تھے۔ خیر تو اس تعریف کے علاوہ ان خطوط کا ڈھرا یہ ہوتا ہے۔ اب کے شمارے کا معیار پچھلے شمارے سے بہتر یا بدتر ہے۔ فلاں مضمون شاہکار ہے۔ فلاں افسانہ کچھ کمزور معلوم ہوتا ہے۔ فلاں نظم سال کی بہترین نظم ہے اور فلاں غزل بھرتی کی ہے۔ اس شاعری کا مضمون کچھ ایسا ہی ہوتا ہے ہاں مصرعے کچھ ٹوٹے پھوٹے بڑھے ہوتے رہتے ہیں۔

کون کہتا ہے کہ ہندوستان میں تجارتی حلقے، سرکاری حلقوں سے ادب کی سرپرستی میں پیچھے ہیں۔ کچھ سرمایہ داروں کی سرپرستی میں ایک بھارتی گیان پیٹھ انعام، کہا گیا ہے جو کسی ہندوستانی ادب کی بہترین کتاب کو دیا جائے گا۔ یہ انعام ایک لاکھ روپے کا ہو گا۔ ریاستی حکومتیں ہزار پانچ سو کا انعام دیا کرتی تھیں۔ مرکزی حکومت نے بڑا تیر مارا تو پانچ ہزار کا انعام ہر زبان کے بہترین ادبی شاہکار پر دینے لگی۔ اب بھارتی گیان پیٹھ ایک لاکھ کا انعام دے گی۔ مگر یہ ابھی معلوم نہیں ہوا کہ اس بات کا فیصلہ کیسے ہو گا کہ بنگلہ زبان کی کتاب، ہندی کی کتاب سے بہتر ہے اور تامل کی کتاب اُردو کی کتاب سے۔ اگر سب کے ترجمے ہندی یا انگریزی میں کرائے جائیں گے تو یہ ترجمے اصل کے معیار کے مظہر کس حد تک ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کتاب بہت اچھی ہو اور ناقص ترجمے کی وجہ سے نظر انداز ہو جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ترجمہ بہت اچھا ہو اور اُس کی وجہ سے کتاب پر انعام مل جائے۔ بہرحال ساری اہم ہندوستانی زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں میں اس خبر سے گدگدی تو پیدا ہو ہی جائے گی۔ یہی کیا کم ہے۔

ابکے امیر خسرو کے عرس کے موقع پر قوالوں کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اور ان میں سے ایک کو تو بلبلِ ہند کا خطاب بھی دے دیا گیا۔ افسوس ہے کہ قوالوں کے مقابلے میں شاعروں کی پوچھ گچھ کم ہی ہوئی۔ حالانکہ اچھے اچھے شاعروں نے اس موقع پر اپنا کلام سنایا تھا مگر کسی کو بلبل چھوڑ کوئل کا بھی خطاب نہ ملا۔ گویا شاعری قوالی سے بھی گئی گزری ہے۔

امام الہند کی یاد میں

حضرت مولانا آزاد کی یاد میں ایک مخصوص ادبی نشست ۱۴ مارچ کی شام کو زیر صدارت ڈاکٹر تارا چند آزاد بھون میں منعقد ہوئی جس میں ممبران انجمن اور سرکردہ ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ سفراء، وزراء، علم دوست خواتین اور ممبران پارلیمنٹ نے بھی شرکت فرمائی۔

جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے انجمن ترقی اردو شاخ دلّی کے صدر پنڈت سندر لال نے فرمایا۔ مولانا کی ذات گرامی رسم و رواج سے بہت بلند تھی وہ سچے مومن تھے اور مولانا کی یہ خاص خصوصیت تھی کہ وہ اپنی زندگی کے اچھے پہلو کو نمایاں کرنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے تھے۔ اس لئے اپنوں اور بیگانوں کے طعن و تشنیع عمر بھر برداشت کرتے رہے۔

مولانا کی مبارک زندگی ایک ایسے ریشمی دھاگے کی مانند تھی جس نے کروڑوں انسانوں کو ملا رکھا تھا۔ دراصل سیکولرازم کے معنی مولانا آزاد ہی نے بتائے۔ ہندی والے بھی ان پر پورا اعتماد کرتے تھے۔ دلّی کے ایک مشہور ہندی پرچے نے مولانا کی وفات کے بعد کہا کہ اگر مولانا زندہ رہتے تو ہمارے مسائل جلدی سلجھ جاتے۔

ڈاکٹر سید محمود نے فرمایا مولانا آزاد کا دل ایسا بیش بہا موتی تھا جس کی مثال ممکن نہیں، ذہانت و ذکاوت اور یادداشت کے لحاظ سے بھی مولانا کو انفرادیت حاصل تھی۔ قلعہ احمد نگر کی جیل میں اپنی یادداشت کی بدولت ۱۹۰۶ء کی پہلی ملاقات کا ذکر انھوں نے اس طرح کیا کہ میں حیران رہ گیا۔ یہ بات بڑی مایوس کن ہے کہ لوگ مولانا کو بھی بھولتے جاتے ہیں، اس میں حکومت اور عوام دونوں شامل ہیں۔ آج کے ہندوستان میں نہ گاندھی جی کسی کو یاد ہیں نہ مولانا آزاد۔ اور ان دونوں کا بھلا دینا گویا انسانیت سے منھ پھیر لینا ہے۔

اجمل خاں صاحب نے جو مولانا آزاد کے پرائیویٹ سکریٹری رہے، کہا کہ مجھے مولانا کے قریب رہنے کا سالہا سال فخر حاصل ہے اور میں سمجھ نہیں سکتا کہ ان کی کس کس بات کا ذکر کروں اور ان کی بلندی طبع شگفتہ خاطر، وجاہت و جودت کا ذکر کرنے کے لئے کون سے الفاظ لاؤں۔ دراصل قومی ایکتا کے معنی مولانا آزاد ہی نے بتائے، تقریر کے آخر میں اجمل خاں صاحب نے مولانا کے خطبہ صدارت رام گڑھ کانگرس کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے۔

ڈاکٹر تارا چند صاحب نے جو ہندوستان کے مشہور مورخ ہیں اپنی فاضلانہ صدارتی تقریر میں فرمایا کہ جب مولانا صاحب، وزیر تعلیم تھے تو مجھے ان کے ساتھ کئی سال تک کام کرنے کا فخر حاصل ہوا۔ ان کے اوصاف کا بیان کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے، مولانا جیسے انسان جہاں اور جس ملک میں بھی پیدا ہوں اس ملک کے لئے لائق فخر ہوتے ہیں۔

مولانا اعلیٰ درجے کے سیاست داں اور قومی رہنما تھے، اردو ادب میں ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ اردو نثر کو انھوں نے نئی راہیں نکال کر ایسی آب و تاب بخشی کہ ان کا نام ہمیشہ دنیائے ادب میں جگمگاتا رہے گا۔ تذکرہ ہو یا غبار خاطر، زبان و بیان ان کے تاج ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ کا دریا امنڈتا چلا آرہا ہے۔

مذہبی لحاظ سے بھی ان کو بہت بلند مرتبہ حاصل تھا اور امام الہند کا لقب ان پر سجتا تھا لیکن افسوس ہے کہ مولانا کے اونچے خیالات کو نہ مسلمانوں نے سمجھا نہ ہندوؤں نے، اور مرتے دم تک مولانا کو یہی صدمہ رہا کہ ملک غلط راہ پر چل رہا ہے اور عوام و خواص میں سے کسی کو بھی ان کے کہنے پر عمل کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ مولانا کو تو سچائی سے محبت تھی وہ دین دھرم کے جھگڑوں سے بہت بلند تھے۔

نشست کے آخر میں پنڈت سندر لال صاحب نے فرمایا کہ ہمارے پاس اکثر یہ شکایت آتی ہے اور خود ہمیں بھی اس کا احساس ہے کہ مولانا کی وفات کو چار سال ہو چکے ہیں لیکن ان کی تصانیف ابھی تک ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے نہیں چھاپی گئیں، اور یہ بڑی افسوس ناک بات ہے۔ اردو دنیا میں اس وجہ سے بے چینی ہے۔ پاکستان سے یہ تمام تصانیف تقریباً اس عرصے میں چھپ کر آگئی ہیں اور یہاں بھی چھپ رہی ہیں۔

ساغر نظامی نے کہا کہ حکومت اور ساہتیہ اکیڈمی کو آب و تاب کے ساتھ چھاپنے کی طرف جلدی توجہ دینی چاہئے۔ یہاں جو کمیٹی مولانا کی تصانیف پر کام کرنے کے لئے بنائی گئی ہے اس کی اجازت کے بغیر یہاں کتابیں کیوں چھاپی گئیں۔

احمد محی الدین صاحب نے دوسرے مقررین کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ کام جلد ہونا چاہیے، مرکزی انجمن اور شاخ دلّی کو چاہئے کہ اس سلسلے میں وہ ساہتیہ اکیڈمی اور حکومت ہند سے شکایت کریں۔

آخر میں روش صدیقی، ساغر نظامی، انور صابری بسمل سعیدی اور سلام مچھلی شہری نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ (سکریٹری)

انجمن ترقی اردو شاخ گلبرگہ

"انجمن کے انتخابات برائے سال ۱۹۶۳ء و ۱۹۶۴ء منعقد کئے جا رہے ہیں۔ ۱۵ مارچ تا ۲۴ مارچ ۱۹۶۳ء عام رکنیت سازی عمل میں آئے گی۔ پرچہ ہائے نامزدگی کے ادخال کی تاریخ ۲۷ مارچ ۱۹۶۳ء مقرر کی گئی ہے۔ دست برداری ۲۰ مارچ ۱۹۶۳ء تک قبول کی جائے گی اور رائے دہی ۳۱ مارچ ۱۹۶۳ء کو صبح ۸ تا ساعت دو پہر بمقام دفتر انجمن (ہلال منزل) غازی پورہ ہوگی مزید تفصیلات دفتر انجمن سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔" (م۔ کنوینر انتخابات انجمن)

عمیق حنفی

نوائے وقت

اے دلِ امن خواب سے جاگ — سرحدوں پر بھڑک اٹھی ہے آگ
وہ بلندی کہ دیکھ کر جس کو — رستے لوٹ لوٹ جاتے تھے
جن ڈھلانوں پہ مست چرواہے — بانسری پر دھنیں بجاتے تھے
سرگیں جھوم جھوم اٹھتی تھیں — بانس بن سیٹیاں بجاتے تھے
دیوداروں کو وجد آتا تھا — دھان کے کھیت لہلہاتے تھے
جن کے پل چھلکتے رہتے تھے — اور تلووں کو گدگداتے تھے
پگھلی چاندی کے تیز رو جھرنے — جن کے سائے میں گنگناتے تھے
اور بادِ شمال کے جھونکے — جن کے پانی میں بھیگ جاتے تھے
شانۂ برہم پتر کو بادل — اپنے پلکوں سے تھپ تھپاتے تھے
کاگریں رے کے بدلیوں کے دل — جن کے ساگر جہاں لٹاتے تھے

لوگ جاتے تھے اور آنکھوں میں
میٹھے سپنے سمیٹ لاتے تھے

آج اس برف پوش وادی میں — ہو گئے ہیں پہاڑ سر بہ کفن
گولیاں چیخ چیخ پڑتی ہیں — گونج اٹھتے ہیں کوہ و دشت و دمن
سرخ ہے برف اور چٹانیں سرخ — سرخ بادِ شمال کا دامن
ابر خونیں ملار گاتا ہے — رقص کرتے ہیں آتش و آہن
بوئے بارود ہے فضاؤں میں — ناک میں دم ہواؤں میں الجھن
آج اس امن دوست وادی میں — بج رہا ہے بگل پڑا ہے رن
جنگ آمادہ دوست ہیں کہ ہوئے — آپ اپنے ضمیر کے دشمن
آستینوں میں ان کی خنجر تھے — بھائی بھائی کی تھی لبوں پہ رٹن
عقل دشمن ہیں جو بناتے ہیں — دوستی کو بھی جنگ کا ایندھن

آج تلوار ہے قلم میرا
کاٹتا ہے فساد کی گردن

ملک فولاد بن گیا ہے آج — سخت دشمن سے اپنی ٹکر ہے
آبروئے وطن سلامت باد — تجھ پہ قربان زیور و زر ہے
مادرِ ہند جان و دل ہیں نثار — یہ ہتھیلی ہے اور یہ سر ہے
موجِ گنگ و جمن ہے تیغ و سناں — موجۂ برہم پتر خنجر ہے
آج باقی نہیں دوئی کا نشاں — ملک کا ملک ایک لشکر ہے
ساری تفریق ایک پل میں مٹی — سر پہ دشمن کے بھی یہ چکر ہے
دشمنِ شرم سوز تنہا ہے — اس کو خود اپنے آپ کا ڈر ہے
سارا عالم ہمارا ساتھی ہے — حق پرستی ہماری رہبر ہے
پیچھے ہٹتے ہیں آگے بڑھنے کو — جنگ کا ایک یہ بھی تیور ہے

ہم اگر ایک اور نیک بھی ہیں
بس یہ سمجھو کہ معرکہ سر ہے

رباعی

یوسف حیدر آبادی

اے چین سنبھل کہ ہند مجبور نہیں — جم جائیں قدم تو فتح کچھ دور نہیں
رستے ہوئے مر جائیں گے ٹیپو کی طرح — ذلت کی مگر زندگی منظور نہیں

مجاہد حسین حسینی

بے نیازی

پیش کرتے ہیں سبھی اب مجھے نذرانۂ دل
جب محبت کی ضرورت تھی محبت نہ ملی
اب تو میں ہوش کی دولت سے بھی بیگانہ ہوں
جب میں باہوش تھا اُس وقت یہ دولت نہ ملی

یاد ایام، میں بے تاب رہا کرتا تھا
کہ کوئی کب مجھے "مانوس" اشارہ کر دے
(تو تو میرا ہے۔ فقط میرا) ان الفاظ کے ساتھ
ایک ذرّے کو بلندی میں ستارہ کر دے

حیف صد حیف کہ یہ خواب ادھورا ہی رہا
کس کو فرصت تھی جو کرتا کسی مفلس کا خیال
سب وہاں مست تھے خود بینی و خودکامی میں
کون تھا دیکھنے والا مرا اندوہ و ملال

لیکن اب میرے اشاروں پہ ہے رقصاں دنیا
جب خدا نے مجھے دنیا سے کیا بے پروا!

غزلیں

عادل منصوری

دروازہ بند دیکھ کے میرے مکان کا — جھونکا ہوا کا کھڑکی کے پردے ہلا گیا
وہ جانِ نو بہار جدھر سے گزر گیا — پیڑوں نے پھول پتوں سے رستا چھپا لیا
اس کے قریب جانے کا انجام یہ ہوا — میں اپنے آپ سے بھی بہت دور جا پڑا
انگڑائی لے رہی تھی گلستاں میں جب بہار — ہر پھول اپنے رنگ کی آتش میں جل گیا

بیکش ناگ پوری

خیرہ مری آنکھیں تھیں وہ جو یہاں دل تھا — نقشِ کفِ پا ان کا رشکِ مہِ کامل تھا
جینے کی تمنا میں مرنا ہی پڑا آخر — تقدیر سے وابستہ حالِ دلِ بسمل تھا
اُس شوخ کے آگے بھی ہر جنبشِ لب مشکل — مانا مرے سینے میں موجود مرا دل تھا
بے خوف و خطر بیکش ٹکرا گیا عالم سے — سینے میں نیا دل تھا یا جذبۂ کامل تھا

نکہت بریلوی

اب اس کی یاد ستانے کو بار بار آئے — وہ زندگی جو ترے شہر میں گزار آئے
یہ بے بسی بھی نہیں لطفِ اختیار سے کم — خدا کرے نہ کبھی دل پہ اختیار آئے
قدم قدم پہ گلستاں کھلے تھے رستے میں — عجیب لوگ ہیں ہم بھی کہ سوئے دار آئے

نہ دل کو آپ کے گریباں سے کیا ملے گا کہ ہم
بفیضِ موسمِ گل پیرہن اتار آئے

بنسی لال

اردو رسم الخط منظم و مدلل اور صوت کے اصولوں پر مبنی ہے

اردو کے طریقۂ تحریر میں یہ خوبی ہے کہ یہ بہت جلد لکھی اور پڑھی جاسکتی ہے۔ یہ سادہ اور آسان ہے اور تحریر میں بہت کم جگہ لیتی ہے۔ اس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں۔ (ا) اس کے حروف بہت سادہ ہیں۔ ایک ہی اُفقی خط 'ـــ' سے چھ مختلف حروف ا ب پ ت ٹ ث بنتا ہے۔ ایک ہی سادہ گھیرے ح (ح) سے چار حروف ج چ ح خ وجود میں آتے ہیں ان کا باہمی امتیاز صرف نقطوں کی تعداد اور ان کے محل وقوع سے پیدا ہوتا ہے (ب) تمام حروف قلم کی ایک ہی جنبش سے یعنی ایک ہی جھٹکے سے لکھے جاتے ہیں مثلاً ج س ق ل م وغیرہ میں سے ہر ایک ایک سرے سے شروع کر کے دوسرے سرے تک بغیر قلم اٹھائے لکھا جاتا ہے اور صرف نقطے ڈالنے کے لئے ہی قلم اٹھانا پڑتا ہے۔ (ج) الفاظ کی بناوٹ میں حروف ابتدائی اور درمیانی جگہ پر مزید مختصر شکلیں اختیار کرتے ہیں جیسے چ حرف چل اور مچل الفاظ کے بتدریج شروع و درمیان میں ایک چھوٹی سی شکل چـ اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح س سبق اور مُست میں سـ شکل۔ اور ف فائدہ اور مفید میں 'فـ' مختصر شکل لیتا ہے۔ (د) ایک ہی جھٹکے سے لکھی جانے والی خوبی نہ ہی صرف حروف میں بلکہ الفاظ میں بھی پائی جاتی ہے جیسے بنفشہ لفظ کا ڈھانچہ 'سعـ' ایک سرے سے دوسرے سرے تک قلم کی ایک ہی جنبش سے لکھ ڈالا جاتا ہے صرف نقطوں کے لئے ہی قلم اٹھانا پڑتا ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر اگر یہ کہا جائے کہ اردو مختصر نویسی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

لیکن اردو کی اس مختصر نویسی کا فائدہ تو تبھی اٹھایا جاسکتا ہے جب اس کی طرز تحریر پر عبور حاصل ہو جائے۔ لیکن اسے سیکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ رومن ہندی وغیرہ رسوم الخط ہفتہ عشرہ میں سیکھی جاسکتی ہیں لیکن اردو سیکھنے میں مہینوں کی سخت محنت درکار ہوتی ہے۔ کیوں؟ اس کے لئے ذیل کی وجوہات ذمہ دار ہیں۔ (ا) ہر ایک تحریر میں دو قسم کے حروف مستعمل ہوتے ہیں۔ حرکات (Vowels) اور سکنات (Consonants)۔ ان دونوں میں حرکات زیادہ اہم ہیں کیونکہ ان کے بنا لفظ کیا اس کا ایک جز بھی وجود میں نہیں آسکتا۔ کوئی بھی ساکن بنا حرکت کے متحرک نہیں ہو سکتا، یعنی اپنی آواز نہیں دے سکتا۔ لیکن حرکات بغیر کسی حرف ساکن کے بھی لفظ بنا سکتے ہیں جیسا 'آ' (فعل امر)۔ دو حرکات کے میل سے 'آئے' (ماضی مطلق) الفاظ بن جاتے ہیں لیکن کوئی بھی حرف ساکن کسی حرکت سے میل کے بنا کوئی لفظ نہیں بنا سکتا۔ تو ایسے اہم کردار ادا کرنے والے حروف حرکت کا اردو کے ابجد میں فقدان ایک ایسا نقص ہے جو کہ تحریر سکھانے میں بہت بڑی رکاوٹ کا موجب ہے۔ مثلاً اردو کی طرز تحریر میں دس حرکات استعمال میں آتی ہیں لیکن ابجد میں انھیں کہیں جگہ نہیں دی گئی۔ وہاں صرف ایک سیدھا خط | (الف) ہی ان سب کی نمائندگی کرتا ہے۔ لیکن یہاں بعد میں ثابت کیا جائے گا کہ یہ الف ایک بے آواز خط ہے جو کہ اصلی حرکات کو ان کی مطلوبہ دوسری (غیر ابتدائی) جگہ دینے کے کام آتا ہے۔ اس کے سوا اس کا کوئی اور کردار نہیں۔ حرکات کی ابجد میں غیر حاضری کی وجہ سے ہی لفظوں کی بناوٹ سکھاتے وقت مبتدیوں کو ہر لفظ میں استعمال شدہ حرکت کی ترکیب سمجھانی پڑتی ہے۔ مثلاً لفظ 'اَب' سکھانے کے لئے طلبہ کو پہلے اَ کی بناوٹ بتلائی ہوتی ہے یعنی یہ کہا جاتا ہے کہ الف اور زبر مل کر اَ بنتا ہے۔ پھر اس اَ کے ساتھ ب ملانے سے اَب لفظ کی تکمیل ہوتی ہے۔ مبتدیوں کو پڑھایا جاتا ہے کہ بچو پڑھو الف زبر اَ۔ بے موقوف اَب۔ یا الف زبر بے اَب اور غریب طلبہ بنا کچھ سمجھے بوجھے اُستاد کی تقلید کرتے ہوئے طوطے کی طرح اسی کو دوہرا دیتے ہیں۔ لیکن اگر اَ حرف اس کی الف اور زبر سے بناوٹ کو نظر انداز کر کے صرف ایک سادہ حرف ابجد میں رکھ دیا جاتا اور اس کی آواز پر ہی اس کا نام اَ (अ ہندی۔ a رومن) بتایا جاتا تو بچے کو اَ اور ب دو آوازوں کو ملانے سے اَب کی بناوٹ بہت جلد سمجھ میں آجاتی۔

یعنی	اَ +	ب =	اَب	پس بنے بنائے اور لفظوں میں مستعمل ہونے کو تیار حروف حرکت کی ابجد میں موجودگی بہت ضروری ہے
(ہندی)	अ	ब	अब	
رومن	a	b	ab	

(ب) ابجد میں سکنات کے نام ان کی آوازوں پر نہیں رکھے گئے۔ مثلاً ج کا نام جیم اور اس کی آواز جَ ہے۔ ن کا نام نون اور آواز نَ (न na) ہے یہ نام اور آواز کا اختلاف بھی اردو سیکھنے میں رکاوٹ کا باعث ہے۔ (س) تحریر میں ایک ہی حرف مختلف حالات میں مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے جیسے ب حرف بن بچ اور لب میں تین شکلیں بـ ـبـ اور ب لیتا ہے لیکن کہیں بھی مبتدی کو نہیں بتایا جاتا کہ کن حالات میں وہ فلاں شکل اختیار کریگا۔ اسی طرح ے حرف کہیں اے کہیں اَے کہیں اِی (ایک میں) اور کہیں اَیہ (اَیت۔ اتوار میں) اور کہیں یہ ساکن (جیسے یک میں) بن جاتا ہے۔ ان شکلوں اور ساتھ ہی آوازوں کی تبدیلی ایک مبتدی کے لئے باعث پریشانی ہے۔ (د) دیگر اردو ابجد میں تقریباً ایک جیسی آواز والے کچھ حروف ہیں۔ جیسے ت ط۔ ء ع۔ ہ ح۔ س ث ص۔ ذ ز ض ظ۔ ان کی آوازوں میں امتیاز ہے۔

لیکن بغیر اس امتیاز کے بتائے کوئی بھی ہندی املا ٹھیک نہیں لکھ سکتا۔ اس لئے ان حروف کا باہمی امتیاز بھانا بھی ضروری ہے۔

میں نے اپنی عمر بھر کی لمبی کھوج سے ان تمام نقائص کو دور کیا ہے۔ اور اُردو تحریر کو صوت کے اصولوں پر قائم کرکے اسے ہندی اور رومن کے بالکل متوازی بنا دیا ہے۔ نیز الف، ہمزہ، نون غنہ، جزم، تشدید، واؤ معدولہ تنوین وغیرہ کی ماہیت اور کردار کی بہت دلچسپ وضاحت پیش کی ہے۔

میری یہ سکیم صرف دلیل اور عام سوجھ بوجھ پر قائم کی گئی ہے اس لئے کوئی بھی شخص جو اردو پڑھنا اور لکھنا جانتا ہے اسے آسانی سے سمجھ سکے گا۔

سکیم - اُردو کا صوتی ابجد

چھوٹی حرکات — نہ ملنے والی لمبی حرکات — ملنے والی لمبی حرکات

اُردو حرکات: اَ اِ اُ - آ (اا) او اَو اُو - اے اَے اِی

متوازی ہندی حرکات: ई ऐ ए ऊ औ ओ आ उ इ अ

متوازی رومن حرکات: ee ai e oo au o aa u i a

سکنات (ب جماعت) ب بھ پ ن ت ٹ ث
ہندی: ट स़ त न प म ब
رومن: ṭ ṣ t n p y b

(ج جماعت) ج چ ح خ م
म ख़ ह़ च ज
m kh ḥ ch j

(س جماعت) س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق
क़ फ़ व ग़ अ ज़ त द स़ श स
q f w g a ẓ ṭ ḍ ṣ sh s

(ل جماعت ۔ ۔ ۔ و جماعت) ل ک گ ہ ۔ ۔
ह ग क ल
د ڈ ذ ر ڑ ز ژ
य ज़ ड़ र ज़ ड द

(بھاری ہندی حروف) بھ پھ تھ ٹھ جھ چھ
ढ भ ठ थ न्ह फ भ
دھ کھ گھ ڈھ دھ ڈھ
ढ ढ घ ध ख ल्ह

نوٹ ۱۔ تمام حروف اپنے متوازی ہندی حروف کی طرح پڑھے جائیں گے۔ مثلاً "اَ" ایک سادہ حرف ہے جس کی آواز अ ہے۔ اس کا ہجہ الف + زبر بالکل نظر انداز کیا گیا ہے۔ اسی طرح اُو ایک بنا بنایا حرف باآواز (ऊ-oo) ہے اور اسے الف پیش واؤ کا مرکب نہیں بتایا جائے گا۔ اسی طرح ن ۔ کا نام نَ (न) ہے نون نہیں۔ س کا نام سَ (स) ہے سین نہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔

نوٹ ۲۔ چونکہ تمام سکنات گونگے حروف ہیں۔ چونکہ بغیر کسی حرکت کے ملاپ کے اپنی آواز نہیں دے سکتے اس لئے تمام سکنات کو ایسے پڑھا جائے گا گویا ان کے ساتھ اَ حرکت ملی ہو۔ جیسے بَ۔ نہ کہ بے وتَ نہ کہ نون ومَ۔ نہ کہ میم۔

جب ہندی مندرجہ بالا ابجد کو اچھی طرح سیکھ جائے تو الفاظ کی بناوٹ اس کے لئے ویسی ہی آسان ہو جائے گی جیسے کہ جبر و مقابلہ میں سادی مساوات۔ جیسے

(الف) ابتدائی حرکات

اَ + ب = اَب		اِ + ن = اِن
अब ब अ		इन न इ
ab b a		in n i
اُ + س = اُس		آ + م = آم
उस स उ		आम म आ
us s u		aam m aa
او + س = اوس		اَو + ر = اَور
ओस स ओ		और र औ
os s o		aur r au
اُو + ن = اُون
ऊन न ऊ
oon n oo

اصول نمبر ا۔ جب اے جماعت کے حروف (اے۔ اَے۔ اِی) کے بعد میں کوئی حرف آ جائے تو ان کے گھیرے سے اور ی اپنی درمیانی شکل "یـ" اختیار کر لیتے ہیں لیکن ان کی آواز نہیں بدلتی۔ جیسے

اے + ک		اَے + ت		اِی + کھ
ایـ + ک		ایـ + ت		ایـ + کھ
ए क		ऐ त		ee kh
= ایک		= اَیت (پنجابی، اتوار)		= ایکھ
एक		ऐत		eekh

غیر ابتدائی حرکات

حرکات کو بغور دیکھو۔

اَ اِ اُ - آ (اا) او اَو اُو - اے اَے اِی

ان سب کے شروع میں ایک سیدھا خط (الف) لگا ہے۔ اگر اس الف کی اپنی کوئی آواز ہوتی تو وہ سب حرکات میں مشترکہ پائی جاتی۔ لیکن یہ بات نہیں۔ ہر ایک حرکت کی

آواز مختلف ہے اور اس میں کچھ بھی مشترک نہیں۔ اس لئے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ابتدائی الف بے آواز ہے اور اصلی آواز دینے والی حرکات وہ شوشے یا گھیرے ہیں جو ابتدائی الف کے بعد لگے ہیں۔

مثلاً اُ میں अ آواز دینے والی اصلی حرکت ـُ ہے اور ابتدائی الف نہیں۔ اسی طرح او میں اصلی حرکت ـو ہے جس کی آواز 'o' ہے اور ابتدائی الف کی کوئی آواز نہیں۔ اسی طرح اُو میں ـُو کی آواز ऊ – oo ہے۔ پس اصلی حروف حرکات یہ ہوئیں۔

ـُو	ـَو	ـو	ـا	ـُ	ـِ	ـَ
ऊ	औ	ओ	आ	उ	इ	अ
oo	au	o	aa	u	i	a

ـی	ـَے	ـے
ई	ऐ	ए
ee	ai	e

ابتدائی الف کے بے آواز ہونے کا مزید ثبوت

(i) او = o	پہلی مساوات میں او = o ہے	
(ii) دو = do	اور دوسری میں دو = do ہے	
(iii) ـو = o	اگر اس میں دونوں طرف سے	

د – d ہٹا دیا جائے تو پھر تیسری مساوات بچ جاتی ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ صرف واؤ کی آواز 'o' ہے۔

لیکن یہ واؤ پہلی مساوات میں بھی موجود ہے، اس لئے وہاں بھی o آواز صرف اسی واؤ کی ہے اور ابتدائی الف بے آواز ہے۔ اسی طرح

(i) اے = e	(i) آ = ا ا (الف الف) = aa
(ii) دے = de	(ii) کا = kaa
(iii) ـے = e	(iii) ـا = ا = aa

یہاں ا + ا مل کر آ بنتا ہے۔ دوسرے الف کی آواز aa ہے پہلے کی کچھ نہیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حرکات میں ابتدائی الف بے آواز ہے تو یہ لگایا کیوں جاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اردو میں اصلی حرکات اتنی کمزور واقع ہوئی ہیں کہ یہ ہمیشہ غیر ابتدائی (دوسری) جگہ پر لکھی جاتی ہیں۔ اور ابتدائی جگہ پر یعنی شروع میں کبھی نہیں لکھی جاتیں۔ اگر ان کے پہلے کوئی حرف ساکن موجود ہو تو قدرتی طور پر ان کو اپنی مطلوبہ دوسری جگہ مل جاتی ہے۔

جیسے د + و = دو لیکن اگر شروع میں کوئی حرف ساکن موجود نہ ہو تو ایک بے آواز فرضی خط ان کے پہلے لگا کر مصنوعی طور پر حرکات کو ان کی مطلوبہ دوسری جگہ دی جاتی ہے۔ جیسے

(i) دو = do
(ii) ـو = o

یہاں پہلی مساوات میں د موجود تھا اور اصلی حرکت 'و' کو قدرتی طور پر دوسری جگہ مل گئی۔

لیکن جب اس میں 'د' ہٹ جائے تو اس کی ابتدائی جگہ خالی رہ جاتی ہے جیسے ایک dash کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ چونکہ اصلی حرکت 'و' اپنی کمزوری کی وجہ سے پہلی جگہ پر لکھی نہیں جاسکتی اس لئے پہلی جگہ خالی رہی۔ لیکن تحریر میں یہ جگہ خالی رکھنا شایاں نہیں اس لئے خلا کو بتانے والی dash ہی گھوم کر سیدھی کھڑی ہو جاتی ہے اور ایک فرضی حرف کی شکل اختیار کرتی ہے۔ جیسے

(i) ـ و = o
(ii) او = o

پس کسی ساکن کے بعد اصلی حرکت استعمال میں آتی ہے اور فرضی خط الف کی ضرورت نہیں رہتی۔

لہٰذا

د + و = دو	س + ـو = سو
d o do	S oo Soo
ک + ـے = کے	د + ی = دی
k e ke	d ee dee
ر + ـَ + ب = رب	د + ـے + ن = دین
r a b rab	d e n den
	س + ـُ + ن = سُن
	S u n Sun

(باقی)

اقبال کرشن

جنگ آزادی کا ترانہ

نیتا جی بجا طور پر ہندوستان کے پہلے سپہ سالار تھے، اور ان کی فوج "انڈین نیشنل آرمی" کا جنگی ترانہ ہمارا پہلا جنگی ترانہ ہے۔ اب جب کہ ہم لوگ جنگی حوصلوں سے سرشار ہیں، ہمیں ایک نظر اس جنگی ترانے پر ڈال لینا چاہئے تاکہ ہمارے حوصلوں کو مزید تقویت پہنچے۔ واضح رہے کہ یہ جنگی ترانہ اردو زبان میں تھا۔

قدم قدم بڑھائے جا
خوشی سے گیت گائے جا
یہ زندگی ہے قوم کی
تو قوم پر لٹائے جا
تو شیر ہند آگے بڑھ
مرن سے پھر بھی تو نہ ڈر
آسمان تک اٹھا کے سر
جوش وطن بڑھائے جا
تیری ہمت بڑھتی رہے
خدا تیری سنتا رہے
جو سامنے تیرے چڑھے
تو خاک سے ملائے جا
چلو دہلی پکار کے
قومی نشاں سنبھال کے
لال قلعہ پہ گاڑ کے
لہرائے جا لہرائے جا

مراسلہ

"انیسویں صدی کے چند اکبر آبادی رسائل و اخبار"

مطبوعہ ہماری زبان مورخہ ۱۵ فروری ۱۹۶۲ء کے ذیل میں راقم سطور نے "مرزا فدا حسین" کو "دامن بہار" کا ایڈیٹر بتایا ہے جس کا حوالہ بیاسہو ڈرہ گیا۔ یہ واقفیت "شاعر آگرہ نمبر" مطبوعہ ۱۹۳۶ء سے حاصل ہوئی ہے۔ اسی طرح "خیال یار" کا مصرع طرح اندراج سے رہ گیا تھا جو یہ ہے: ع

باقی آنکھوں کا فقط ہوا ہے پردا کیا ہے

(۱) آگاہ (۲) راقم (۳) اور عاشق تلامذہ غالب نیز (۴) ظہیر تلمیذ ذوق کے پتے غزلیات مطبوعہ رسالہ "خیال یار" کے عنوانات میں بالترتیب حسب ذیل مندرج ہیں:

(۱) "ساکن حال جے پور، محلہ موتی کٹرہ"
(۲) "جے پور، بلند چاہ"
(۳) "تھانہ دار علاقہ ریاست دوسے پور، ملک میواڑ"
(۴) "جے پور، محلہ موتی کٹرہ مکان منور علی کمیدان"

راقم نے شاعر آگرہ نمبر کے لئے "مجریہ ۱۹۳۶ء" لکھ دیا ہے جس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ماہنامہ شاعر کا سال اجرا ۱۹۳۶ء ہے۔ جو تاہر ظہور صحت سے بعید ہے۔ کیونکہ نام بردہ رسالہ کا سال اجرا ۱۹۳۰ء ہے۔ ۱۹۳۶ء میں تو اس کا "آگرہ نمبر" منطبع ہوا تھا۔ یہ وہی مشہور ماہنامہ ہے جو مدتوں "قصر الادب آگرہ" سے علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم کی زیر نگرانی اشاعت پذیر ہوتا رہا ہے اور اب بمبئی سے زیر ادارت جناب اعجاز صدیقی شائع ہو رہا ہے۔ "شاعر آگرہ نمبر" میں آگرے سے متعلق مصنفین و ادبا اور شعرائے کرام نیز ان کے کارناموں کا خصوصی بیان ہے۔ اس سے پہلے کا کوئی رسالہ آگرے سے متعلق یکجائی اتنی واقفیت بہم نہیں پہنچاتا۔

(سراج دھولپوری)

امیر خسرو کو خراج عقیدت

نئی دہلی میں ۱۹ مارچ کو مرکزی وزیر رسل و رسائل شری جگ جیون رام نے کل یہاں حضرت خواجہ امیر خسرو کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ امیر خسرو صرف اُردو زبان یا مسلمانوں کے نہیں تھے بلکہ دنیا کی دولت تھے۔ انھوں نے کہا ہندو اور مسلمان سب یہاں جمع ہیں۔ انھیں ان کی خوبیاں اپنے اندر پیدا کرنے اور ان سے سبق لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔

شری جگ جیون رام بستی نظام الدین میں امیر خسرو کے ۶۵۰ ویں عرس کی آخری مجلس میں تقریر کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ مرکزی وزیر شہری ہوا بازی شری احمد محی الدین اور ہندوستان میں ترکی کے سفیر بھی اس تقریب میں موجود تھے۔

شری جگ جیون رام نے کہا کہ ہندوستانی کلچر ایک مشترکہ کلچر ہے اور آج جو کچھ ہمارے ہندوستان میں ہے وہ ہر ایک ہندوستانی کا ہے۔

قومی اتحاد پر زور دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ سبھی مذہبوں کے بنیادی اصول ایک ہیں۔ اور دنیا کا کوئی مذہب آپس میں لڑائی نہیں سکھاتا۔

نائب وزیر شہری ہوا بازی شری احمد محی الدین نے اپنی تقریر میں کہا کہ امیر خسرو ایک ایسی بڑی ہستی تھی جس نے شاعری، موسیقی اور مختلف فنون میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔

شری احمد محی الدین نے جو خسرو اکیڈمی کے سکریٹری بھی ہیں مزید کہا کہ یہ اکیڈمی امیر خسرو کے دوہے اور اشعار جمع کرنے ان کے بارے میں تحقیق کرنے اور انھیں شائع کرنے کے لئے قائم کی گئی ہے جس کی اشد ضرورت ہے۔

جمکھنڈی میں یوم آزاد

آزاد لائبریری (بیجاپور) کے زیر اہتمام ۹ مارچ ۶۳ء کو یوم آزاد منایا گیا، عبدالرحیم صاحب سول جج بیجاپور نے صدارت فرمائی۔ اس موقع پر لائبریری کی نئی عمارت کا افتتاح بھی کیا گیا۔ صدر لائبریری نے اپنے خطبۂ استقبالیہ کے بعد صدر جلسہ سے درخواست کی کہ وہ لائبریری کی نئی عمارت کا افتتاح فرمائیں۔ بعد ازاں سکریٹری آزاد لائبریری نے اپنی سالانہ رپورٹ پڑھی جس میں عبدالرحمن خاں لکچرار ایس، ٹی کالج بلگام نے مولانا آزاد کے متعلق ایک پُر مغز مقالہ پیش کیا۔

شام راؤ دانوے ایڈیٹر نو ہند (جمکھنڈی)، قاضی سراج الدین تالیکوٹ (مدیر رفیق)، حبیب الدین بخشی اور غلام نبی بالسنگ سابق صدر انجمن ترقی اُردو بیجاپور نے بھی مولانا آزاد کو خراج عقیدت پیش کیا۔ آخر میں صدر جلسہ نے مولانا آزاد کی قوم پرستی و بے باکی کو سراہتے ہوئے سامعین کو تلقین کی کہ وہ مولانا کی بتائی ہوئی راہ پر عمل پیرا ہوں۔

یوم آزاد ہی کے سلسلے میں ایک غیر طرحی محفل شعر و سخن بھی منعقد ہوئی۔ مدہول اور جمکھنڈی کے قرب و جوار سے بہت سے شعرا نے شرکت کی۔

پاتور میں "انجمن اُردو ادب" اور "آزاد لائبریری" کا قیام

پاتور (ضلع آکولہ) کے نوجوانوں نے اُردو زبان کی ترقی کے لئے "انجمن اُردو ادب" کے نام سے ایک انجمن تشکیل کی ہے جس کے تحت ایک "آزاد لائبریری" بھی قائم کی گئی ہے اس کا افتتاح قاضی محمد ابراہیم علی صاحب نے فرمایا۔

افتتاحی جلسے کی صدارت قطب الدین صاحب نے فرمائی۔ جناب قاضی محمد علی صاحب وکیل نے اُردو زبان کی اہمیت پر تقریر فرمائی اور جناب صابر نے مالی امداد کی ضرورت کو واضح کیا۔ حاضرین نے (علاوہ کتابوں کے) تقریباً پونے تین سو روپے عطیہ دینے کا وعدہ فرمایا جس میں سے کچھ رقم نقد بھی دی گئی۔ (جہانگیر چودھری سکریٹری)

انجمن معین الادب سہسرام کا سالانہ جلسہ

انجمن معین الادب سہسرام کا سالانہ جلسہ ۱۷ مارچ ۶۳ء منعقد ہوا۔ جس میں کافی تعداد میں لوگ شریک ہوئے مجلس عاملہ کے ممبران و عہدہ داران انجمن کا انتخاب سنہ ۱۹۶۳ء کے لئے عمل میں آیا۔

شاعرستان حیدرآباد

۸ مارچ سنہ ۶۳ء کو شاعرستان کا ادبی اجلاس و مشاعرہ ہوا جس کی صدارت شری کالی چرن گپتا ماہی نے کی۔ شعرا نے کلام سنایا۔ ایک ریزولیشن محکمۂ بلدیہ کو دیا گیا کہ فصاحت جنگ جلیل مرحوم کی یادگار میں حسب نشاندہی جلیل روڈ کی منظوری کونسل سے حاصل کر کے جلیل روڈ کا اعلان کیا جائے۔

ضروری گزارش

براہ مہربانی انجمن سے متعلق جملہ خط و کتابت اور ارسال زر "جنرل سکریٹری" انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ کے پتہ پر فرمایئے۔

بعض خطوں پر منصب کی بجائے نام لکھا ہوتا ہے ایسے خطوں کی تعمیل میں مختلف وجوہ سے دیر ہو جاتی ہے۔ جس کے نام خط لکھا گیا ہے اگر وہ کارکن چھٹی پر ہو، بیمار ہو، دورے میں ہو یا عدم موجودگی کی کوئی اور صورت ہو تو وہ ڈاک کھلتی نہیں اور اہم خطوط کا جواب بر وقت نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ آپ ہمیشہ اپنے خط "جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ" کے پتے پر بھیجئے۔ شکریہ

ضروری نوٹ

(ایجنٹ حضرات اور خریداران) [illegible] ہے وہ اسی
[illegible] علامت ہے کہ [illegible]
[illegible] مہربانی فرما کر
ہماری زبان کی سالانہ [illegible]
[illegible] بھیج کر [illegible]

منیجر

از ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

منشی جگن ناتھ خوشتر لکھنوی

خوشتر تخلص، منشی جگن ناتھ نام، منشی منالال کے بیٹے تھے۔ لکھنؤ کے محلہ نوبستہ میں پیدا ہوئے اور یہاں ہی تعلیم و تربیت پائی۔ ان کے بزرگوں کا وطن قصبہ موہیہ ضلع اناؤ تھا۔ خوشتر واجد علی شاہ کے دفتر میں متصدی تھے۔ ۱۸۶۴ء میں وفات پائی "رامائن خوشتر" کے علاوہ شریمد بھاگوت منظوم اور مثنوی چترگپت جس کا نام پدم پوتھی ہے آپ کی یادگار ہیں۔ "رامائن خوشتر" جو مثنوی میں ہے اس کا کچھ انتخاب ۱۹۱۰ء میں ٹیکسٹ بک کمیٹی نے کورس میں شامل کر لیا تھا لیکن اب ہمارے جدید تذکرہ نویسوں نے آپ کا ذکر نظر انداز کر دیا ہے۔ محمد سلیم صدیقی (لکھنؤ یونیورسٹی) اردو ایسوسی ایشن میگزین الہ آباد یونیورسٹی بابت ۱۹۲۸-۲۹ء کے صفحہ ۳۴ پر لکھتے ہیں:

> "جگن ناتھ خوشتر نے دوسری بار رامائن کا منظوم ترجمہ اردو میں کیا جو آپ کی شیریں کلام کا اچھا نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے بھاگوت اور مثنوی چترگپت کا ۱۲۷۹ھ میں سنسکرت سے منظوم ترجمہ کیا۔ زبان صاف اور شیریں ہے جس میں نہ سنسکرت کے الفاظ کو دخل ہے نہ بھاشا کی کھپت، کلام پر استاد غالب کا اثر غالب ہے۔"

حضرت عشرت لکھنوی مرحوم "ہندو شعرا" میں صفحہ ۵۲ اور ۵۳ پر لکھتے ہیں:

> "منشی جگن ناتھ ولد منشی منالال کایستھ لکھنوی آخری شاہ اودھ کے دفتر میں متصدی تھے ان کی تصنیف سے "رامائن خوشتر" "شریمد بھاگوت" اور مثنوی چترگپت اردو نظم میں مشہور کتابیں ہیں۔ غدر کے سات برس کے بعد ۱۸۶۴ء میں انتقال کیا۔"

خوشتر کی مقبولیت اور شہرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے ہر ہندو گھر میں جن کی مادری زبان اردو ہے "رامائن خوشتر" ضرور ملے گی۔ رامائن خوشتر پہلی مرتبہ ۱۸۶۴ء میں مطبع منشی نول کشور میں چھپی اور اس کے بعد اس کے سولہ (۱۶) اڈیشن اسی مطبع سے شائع ہوئے۔ سولھواں اڈیشن ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۸۶۴ء میں پہلی مرتبہ یہ رامائن شائع ہوئی، تو نسیم دہلوی نے یہ تاریخ کہی: ؎

عیسوی تاریخ لے فکر رسا
لکھ "چھپے خوشتر کے افکار بجا"

اردو کے مثنوی نگاروں میں میر حسن، پنڈت دیا شنکر نسیم، احمد علی شوق قدوائی، مرزا شوق، جگر بریلوی، برق سیتاپوری، راحت کاکوروی، فرحت اور منشی سول چند منشی کافی مشہور ہیں لیکن اس صنف سخن میں ان کی شہرت مثنوی رامائن خوشتر کے پیش نظر کسی سے بھی کم نہیں ہے۔ یہ مثنوی ان کا کارنامہ کہنا چاہئے اور اس کا شمار اردو کی بہترین مثنویوں میں ہو سکتا ہے۔ سلاست زبان، پختگی بیان، بندش کی چستی اور شگفتہ طرز بیان میں یہ مثنوی لاجواب ہے۔ منظر نگاری اور واقعات نگاری کے دل کش اور اثر آفریں نمونے اس میں ملتے ہیں۔ چند اشعار درج کئے جاتے ہیں:

ہوا جب مطلع خورشید روشن
گلستان جہاں میں جلوہ افگن
ہوا مشرق سے ظاہر عارض حور
رخ عالم پہ چمکا پرتو نور
اڑا زاغ سیاہ شب جہاں سے
ہمائے روز نکلا آسماں سے
ہوئی قوس ہلال شب شکستہ
عروس صبح نکلی دست بستہ
فلک پر شاہد خورشید آیا
دُر شبنم کا زیبا ہار لایا
ہوا بیدار، شاہ بخت بیدار
شہنشاہ جنک پور نیک کردار
شہ روشن جبین و ماہ سیما
ہوا تخت شہی پر جلوہ فرما
کہا بزم شہاں آراستہ ہو
مکان خسروی پیراستہ ہو
شہنشہ آج ہوں سب رونق افزا
کہ ساعت احسن فرخ ہے امروز
بحکم شاہ تب باشان و شوکت
ہوئے مصروف سب ارکان دولت
ہزاروں زود کار و تیز فراش

ہوئے حاضر ادب سے شاد و بشاش
ہزاروں خیمۂ سنجاب و قاقم
کہ عقلِ چرخِ اطلس جس میں ہو گم
کئے آراستہ میداں میں ہر جا
قرینے سے بہ آئینِ مصفا
ہزاروں شامیانے پرنیانی[1]
کیودی اور عنابی زعفرانی
کئے آراستہ درجے بدرجے
صفائی سے ہر اک خیمہ کے آگے
بچھایا اس میں فرشِ شال و دیبا
جو تھا اس خیمۂ رنگیں کو زیبا
مرصع سیکڑوں سونے کے دنگل[2]
زرو یاقوت و نیلم سے مکلل
بچھے زریں ہزاروں تخت و کرسی
کہ ترسیں بیٹھنے کو جس پہ قدسی
ہوا آراستہ جب سب یہ ساماں
ہوا خوش دیکھ کر یوں شاہِ دوراں
جنک پور میں جو وارد تھے شہنشاہ
کیا سب کو شہ نزہت نے آگاہ
وفورِ شوق سے بے صبر و طاقت
شتاباں آئے سوئے بزمِ عشرت
ہر اک کو شاہ با تعظیم لایا
بہ عزت کرسیِ زر پر بٹھایا
رعایا شہر کی بہرِ تماشا
ہوئی دربارِ شہ میں جمع ہر جا
بٹھایا شہ نے با تکریم سب کو
مناسب کی جگہ تقسیم سب کو
بہ لطفِ شاہ کم کوئی نہیں تھا
جو ادنیٰ تھا وہاں کرسی نشیں تھا

۱؎ پرنیاں: ایک قسم کا بیش قیمت ریشمی کپڑا۔
۲؎ ایک طرح کی بڑی کرسی۔

بقیہ۔ اردو میں جدید طرز کا پہلا قصہ

غالباً ان سطور کے پڑھنے والوں کے سامنے "خطِ تقدیر" کا متن نہیں ہے اس لئے یہاں اس کا تنقیدی جائزہ لینا مناسب نہیں ہے اس قصّے کا صرف تعارف کرانا مقصود ہے اور تعارف کے سلسلے میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک تمثیلی ALLEGORICAL افسانہ ہے جس کے کردار تدبیر، عقل، اتفاق، کفایت شعاری، آمدنی اور خرچ وغیرہ ہیں لیکن ان کرداروں کی مدد سے مولوی کریم الدین نے جو فضا تیار کی ہے وہ وہی ہے جس میں وہ سانس لیتے رہے۔ مصنف کا بنیادی خیال یہ ہے کہ ہم جسے تقدیر کہتے ہیں وہ دراصل تدبیر کا دوسرا نام ہے، ہر دور میں موقع اور کامیاب زندگی گزارنے کے لئے انسان نئی نئی تدابیر اختیار کرتا ہے آج جبکہ انگریز ہمارے حکمراں ہو گئے ہیں، ہم کو زندگی کا چلن ان سے سیکھنا چاہئے اور تعلیم و تربیت اور تہذیب و تمدن کے باب میں روایتی نقطۂ نظر ترک کر دینا چاہئے۔ یہ قصہ جو گیارہ ابواب پر مشتمل ہے، ان مسائل سے بحث کرتا ہے جو ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بعد ہندوستانیوں کو پیش آئے۔ اس تمثیل کا اہم کردار طالبِ تقدیر ہے جو نانِ شبینہ اور سکونِ قلب کی تلاش میں نکلا تھا۔ وہ محنت کرنے کے بجائے ملکۂ تقدیر سے محبت کرنے لگا۔ اس نے دیکھا تھا کہ کچھ لوگ بخت و اتفاق کے سہارے بڑے آدمی ہو گئے ہیں، پھر میں کیوں نہیں ہو سکتا مگر بخت و اتفاق سے دنیا کے مسائل تو حل نہیں ہوتے۔ راہِ طلب میں اس پر کیا کچھ نہیں بیتی مگر ملکۂ تقدیر اس کے قبضے میں نہ آسکی۔ آخر میں اسے معلوم ہوا کہ جب تک عقل اس کی مدد نہیں کرے گی اسے ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا طالبِ تقدیر کو راہِ طلب میں جو مسائل پیش آئے ان میں سے بعض یہ ہیں: زراعت، تجارت، ملازمت یا سوداگری میں سے کون سا پیشہ اختیار کرنا چاہئے اور کیوں۔ تعلیم و تربیت کی سماج میں قدر و قیمت کیا ہے اور اس کا ڈھانچہ کیسا ہونا چاہئے۔ انگریزوں سے ہم کیا اور کتنا سیکھ سکتے ہیں، توہمات سے نجات پانے کا کیا طریقہ ہے؛ اس کا کیا سبب ہے کہ اب ہندوستان میں نہ تو کوئی نیا ہنر اختراع کیا جاتا ہے اور نہ علم کی نئی نئی راہیں نکالی جاتی ہیں۔

کریم الدین کوئی بڑے فن کار نہیں تھے، ان کی تصنیفات اور تالیفات درسی ضروریات پوری کر سکتی ہیں، ان کے اس قصّے میں فکر و فن کی وہ پختگی نہیں ملتی جو نذیر احمد کے ناولوں کی جان ہے۔ پھر بھی ان کا یہ کارنامہ اردو کے افسانوی ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ یہ داستانوں اور نذیر احمد کے ناولوں کی درمیانی کڑی ہے۔ قصہ نگاری میں مولوی کریم الدین ڈپٹی نذیر احمد کے پیش رو تھے، مولوی کریم الدین کی بنیاد پر ڈپٹی نذیر احمد نے عمارت کھڑی کی۔ خلاصے کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے افسانوی ادب میں مغربی اقتدار کے زیرِ اثر جو تبدیلی ہوئی ہے، اس کا اولین نمونہ مولوی کریم الدین کی خطِ تقدیر ہے، ڈپٹی نذیر احمد کی مراۃ العروس نہیں۔

مالک انجمن ترقی اردو علی گڑھ، پبلشر نذیر حسن، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا